قائدِ اعظمؒ

تحریکِ بازیابیٔ شوکتِ رفتہ

کے

آخری رہنما

○

شائع کردہ : مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

لاہور

۱۹۷۶



بسلسلہ تقریبات صد سالہ قائد اعظم

۱۹۷۶ء

یہ مقالہ

ڈاکٹر سید عبداللہ
معتمد عمومی
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

نے

لکھا

اردو اکیڈمی
Rs.....2.....

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔

قائد اعظم کے سیاسی کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، میں اپنے اس مقالے میں تاریخی پس منظر کی روشنی میں ان کی سیاسی بصیرت و عظمت کا مختصر سا تجزیہ کر رہا ہوں۔ قائد اعظم بے شمار اوصاف اور قابلیتوں کے مالک تھے، لیکن اس موقع پر میں انھیں تحریک بازیابی سلطنت گم گشتہ کے آخری رہنما کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بازیابی یا بازیافت سے میری مراد ہے مسلمانانِ ہند کا یہ احساس کہ انھیں اُس متاعِ عزیز کو دوبارہ حاصل کرنا ہے جسے وہ اپنی غفلتوں کے باعث یا اتفاقات و حادثات کے قدرتی اثرات کے تحت کھو چکے ہیں۔ ان حادثات میں اقتدار کا خاتمہ بھی شامل ہے۔

یُوں تو احساسِ زوال کا آغاز شاہجہاں کی جانشینی کی جنگ سے ہی ہو چلا تھا، لیکن اس کا شدید اثر اورنگ زیب کی بادشاہی کے آخری برسوں میں نمودار ہوتا نظر آتا ہے۔

اس احساس نے پانچ صورتیں اختیار کیں :

الف : اندرونی تضادات کا احساس ؛

ب : ہندوؤں کی بیداری کا احساس اور اس کا مقابلہ کرنے کی تحریک ؛

ج : فرنگیوں کے غلبے کا احساس اور مزاحمت کی مختلف تدابیر ؛

د : سلطنتِ مُغلیہ کے مکمل خاتمے کے بعد بازیابی کی جذباتی، عقلی اور آئینی صورتیں ؛

ہ : بازیابی کی آخری مُنظّم تحریک ـــــ تحریکِ پاکستان ۔

یہ حقیقت ثابت کی جاسکتی ہے کہ مُسلمانانِ ہند دورِ زوال و محکومی کے ہر مرحلے پر اپنی حکومت کے قیام بارِ دیگر کے لیے آرزو مند اور مضطرب رہے ۔ اس کا ثبوت ادب کی کتابوں میں بھی موجود ہے اور تاریخ و سوانح میں بھی ۔

تحریکِ پاکستان بھی اسی آرزوئے بازیافت کا تکمیلی مظاہرہ تھا اور قائداعظم اس کے عملی رہنما اور آخری ناظم و منتظم تھے ۔ یہ کسی نسل یا قبیلے کی تحریک نہ تھی بلکہ ایک ایسے معاشرے کی جدوجہد تھی جس نے کم و بیش ایک ہزار برس تک اس ملک میں حکومت کی تھی ۔ بلاشبہ اس میں قبیلے ہی حکمران رہے لیکن ان قبیلوں کی قوت کا سرچشمہ قبائلی احساس نہ تھا بلکہ سب مسلمانوں کا وہ اجتماعی شعور تھا جو رنگ و نسل سے بالاتر ایک عقیدے سے وابستہ تھا ۔ مسلمان اس عقیدے کے تحت زوال کے بعد دوبارہ اُبھرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور میں نے اسے تحریکِ بازیابی کا نام دیا ہے ۔

اس احساسِ بازیابی یا تحریکِ بازیافت کی کہانی طویل ہے جیسا کہ پہلے بیان ہُوا ہے اس کے اوّلین آثار احساسِ تضاد سے اُبھرے ۔ شاہجہان کے تخت

کے لیے جو ہولناک جنگ اس کے بیٹوں کے مابین ہوئی اس کے متعلق ایک معاصر شاعر بہشتی نے آشوب نامۂ ہندوستان کے نام سے ایک نظم لکھ کر حکمرانوں کو متوجہ کیا کہ اس قسم کی خانہ جنگیوں کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ تخت نشینی اور جانشینی کے لیے کچھ ضابطے اور قاعدے وضع ہونے چاہئیں ۔

اورنگ زیب کے زمانے میں جو تاریخ نویسی ہوئی اس میں بھی تضاد نظر آتا ہے ۔ یہ ایک دُوسری صورت میں نمایاں تھا وہ یُوں کہ ہندو اور ایرانی تاریخ نگاروں کا ایک گروہ مرکزی قوت کے خلاف جانب دارانہ تاریخیں لکھنے لگا ۔ چنانچہ خافی خان، سُجان رائے بٹالوی اور نعمت خان عالی کی تواریخ مرکزی قوت کے خلاف تعصبات اُبھارتی نظر آتی ہیں ۔

اورنگ زیب کے بعد یہ رُجحان اور بھی شدید ہو جاتا ہے جو یقیناً زوال کا آئینہ دار تھا ۔

ان تضادات کو دیکھ کر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان تباہ کن رجحانات کے خلاف آواز بلند کی ۔ آزاد بلگرامی نے اپنے احساسات کو دو صورتوں میں قلم بند کیا ۔ اوّلاً انھوں نے حکمران قوم کو اُن کی کمزوریوں اور عیش کوشیوں کے معاملے میں متنبہ کیا ۔ چنانچہ اپنے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں انھوں نے مرہٹوں کے غلبے کی دو وجہیں بتائی ہیں : ایک یہ کہ مسلمانوں نے فوجی زندگی ترک کر دی ہے اور مشاغلِ بزم اختیار کر لیے ہیں ، گھوڑوں کی پرورش ترک کر دی ہے اور میلے ٹھیلے کے شائق ہو گئے ہیں ؛ دوسری وجہ ہے کہ ادیبوں اور مؤرخوں کے چند طبقے مرکزی قوّت کے

خلاف متعصبانہ رویہ رکھتے گئے ہیں۔

آزاد بلگرامی کے احساسِ تضاد نے ایک دوسری جہت یہ اختیار کی کہ بعض غیر ملکی عناصر کے عام پروپاگنڈا کے برعکس سلمانانِ ہند کی ہندی قومیت اور اُن کے پیدا کردہ ادب کی مستقل قدر و قیمت کے حق میں آواز بلند کی۔ چنانچہ ان کی کتابیں "غزلان الہند" اور "مآثر الکرام" وغیرہ اسی نظریے کی پاسدار ہیں۔ یوں اس معاملے میں سراج الدین علی خان آرزوؔ بھی ان کے ہم نوا بلکہ ان سے بڑھ کر سرگرم نظر آتے ہیں۔

زوال کا احساس اورنگ زیب کے بعد فارسی ادب میں "اسپ ناموں" کی کثرتِ تصنیف اور بعض ناموں کی تعداد سے بھی ظاہر ہوتا ہے جن میں بار بار مصنف یہ نصیحت دُہراتے ہیں کہ مسلمانوں میں گھوڑے کی تربیت اور شکار کی ریاضت ختم ہو رہی ہے جس کا نتیجہ وہ زوال ہے جو نظر آ رہا ہے۔

عہدِ محمد شاہ کے بعد اُردو میں شہر آشوب نظمیں بکثرت لکھی جاتی ہیں۔ خواجہ میر دردؔ تصوف میں ایک اصول لے کر آتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم محمدی (جماعت) کے لوگ تصوف کی گمراہ کن اصطلاحوں میں یقین نہیں رکھتے۔ ہم مصطفوی اصطلاحات میں یقین رکھتے ہیں (یاد رہے کہ محمدی سے مُراد ہے طریقۂ محمدیہ کے پیرو جس کی بنیاد خواجہ میر درد کے والد نے رکھی تھی)۔ اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ زوال سے پیدا شدہ تضادات کا نیا حل تجویز کرتے ہیں اور وہ تھا: (۱) الانصاف فی الاختلاف (یعنی سعی مفاہمت و تطبیق)؛ (۲) زندگی کا ایک نیا اجتماعی فلسفہ اور (۳) تحریکِ بازیافت کی تنظیم اور اس کے لیے جہاد۔ انھوں نے سب قوتوں

کو جمع کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا۔

شاہ صاحب اپنے وصیت نامے میں اپنے فرزندوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "در آفتاب نشینید کہ آفتاب حمامِ عرب است خشن پوشید و بر اسپاں جہندہ بنشینید" (دھوپ میں بیٹھو کہ دھوپ حمامِ عرب (صحت کے لیے مفید) ہے۔ گاڑھا پہنو اور گھوڑوں پر جست لگا کر چڑھو)۔ یہ شاہ ولی اللّٰہی تحریک آگے چل کر ایک طرف سکھوں سے ٹکرا گئی اور دوسری طرف بعد میں انگریزوں سے نبرد آزما ہو گئی جو تقریباً ڈیڑھ سو سال تک کبھی وہابی تحریک، کبھی جہادِ آزادی کے نام سے کبھی بنگالے کی سلم (معاشی) تحریکوں کی صورت میں برابر جاری رہی۔

انگریزی دور کے آغاز میں ایک شخص آگاہی نے "تازیانۂ غفلت" کے نام سے فارسی میں ایک رسالہ لکھا جس میں مسلمانوں کی غفلتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتایا کہ ایک مسلم کا پہلا فرض اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔

سر ولیم ہنٹر نے "اور انڈین مسلمان" کے نام سے جو کتاب (انگریزی میں) لکھی اس میں اس قسم کے بعد رجحانات کا تذکرہ کیا ہے جس پر سر سید کی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" کو ایک مفاہمتی تبصرہ کہنا چاہیے۔ آگے چل کر سرائل او ڈوائر نے (ہندوستان میرے علم و مشاہدہ کی رُو سے) اپنی کتاب میں ان سرگرمیوں پر مزید روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں بارِ دیگر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ان انگریز مصنفوں نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف ایک مقدمہ کھڑا کیا جا سکے مگر اپنی جگہ یہ اطلاع کچھ غلط بھی نہ تھی کہ اس زمانے میں

ہر مسلمان بازیافت کے جذبے سے سرشار تھا۔ بعد میں تحریکِ ریشمی رومال، تحریکِ خلافت اور تحریکِ اتحادِ اسلام اسی جذبے کے خارجی مظاہر تھے۔

بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں یہ جذبہ دو مختلف صورتوں میں متشکل ہوگیا ایک صورت تو وہی دعوتِ جہاد تھی جس کا ذکر اوپر ہُوا اور دوسری صورت، آئینی جدوجہد تھی جو بطور تقاضائے وقت اختیار کر لی گئی تھی۔ قائدِ اعظم کی تحریک میں یہ دونوں صورتیں جمع ہوگئیں۔

آج کچھ لوگ تحریکِ پاکستان کا تجزیہ کرتے ہُوئے صرف ان تحریروں اور دستاویزوں کو دیکھتے ہیں جو سیاسی رہنماؤں نے خاص خاص مواقع کے لیے تیار کیں اور ان کی بنا پر یہ فیصلہ دے رہے ہیں کہ تحریکِ پاکستان محض معاشی یا محض سیاسی محرکات کا نتیجہ تھی، لیکن یہ حقیقت ہر شک وشبہ سے بالا ہے کہ مسلمان عوام نے اسے تحریکِ بازیافت سمجھ کر اس کا ساتھ دیا تھا اور اس میں دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی جملہ محرکات شامل تھے۔

قائدِ اعظم نے جس دن ہندی مسلمانوں کی الگ قومیت کا اعلان کیا اس دن سے ہی ان کی دعوت مقبول ہوتی گئی۔ یہ الگ قومیت کیا تھی۔ اس کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں، لیکن اس کے حق میں ایک بڑی دلیل یہ بھی دی گئی تھی کہ مسلمانوں نے کم وبیش ایک ہزار سال تک اس ملک پر حکومت کی۔ لہٰذا یہ ان کے شعورِ اجتماعی کا ایک مرکزی نکتۂ عرفان ہے کہ انھیں دوبارہ اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہو۔

قائدِ اعظم نے مسلمانانِ ہند کے اس جذبۂ بازیافت کا لحاظ رکھتے ہُوئے

مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تاریخ کا مسئلہ بنا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کی بُنیاد اس دن رکھ دی گئی تھی جس دن برِصغیر کا پہلا شخص مسلمان ہُوا تھا۔"

اس کے معنی یہ ہُوئے کہ پاکستان اور مسلمان دو مترادف الفاظ تھے اور یہ ترادف صرف نظری مسئلہ نہیں بلکہ اس میں وہ سب عملی صورتیں شامل ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کے اعمال وکردار سے وابستہ تھیں ان میں ایک صورت اپنی سلطنت کا دوبارہ قیام تھا اور یہ وہ شعور تھا جو مسلمان قوم کے نفسِ اجتماعی کا جُزو بن چکا تھا۔

قائدِ اعظم کی تحریک اسی شعور کی ایک خارجی صورت تھی جس کے لیے انھوں نے طریقِ جدوجہد اپنے دَور کے حالات اور انگریزوں کی آئینی اصطلاحات کے مُطابق تجویز کیا۔ انھوں نے ہر اعتراض کا وہی جواب دیا جس کی تقاضائے وقت ضرورت تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے تاریخ پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ موجودہ صورتِ حال کے مُطابق اپنے دلائل مُرتّب کیے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ان کے دلائل عُلما کے دلائل سے مختلف ہو گئے۔ عُلما اس وقت دو گروہوں میں بٹے ہُوئے تھے: ایک وہ جن کے دلائل خالص دینی مصطلحات پر مبنی تھے ان کی تحریروں اور تقریروں میں دین کا بول بالا، غلبہ اور اسلام کی حکومت اور خدا کی بادشاہت جیسے پیرایے بار بار دہرائے جاتے تھے؛ دوسرا گروہ وہ تھا جو یُوں سوچتا تھا کہ مذکورہ بالا نعروں کو سرِدست ملتوی رکھ کر ملک سے انگریزوں کو نکالا جائے، اس کے بعد مسلمان اپنے لیے کسی نظام

ہے (میں یہاں زبان سے مُراد اُردو بھی لے سکتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ قائدِ اعظم کے مدِنظر اردو ہی تھی، لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ہندوستان بھر کی زبانوں میں جو مقامی طور پر مسلم باشندوں میں مروّج تھیں مسلم محاورہ ہندو محاورے سے جُدا تھا اس لیے میں نے قائدِ اعظم کے استعمال کردہ لفظ کے ترسیعی معنی مُراد لیے ہیں)؛

۵- یہ اس لیے جُدا ہیں کہ ادب میں ان کا مزاج الگ پہچانا جاتا ہے (یعنی ایک عبارت کو یا کتاب کو پڑھ کر صاف پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمان کی لکھی ہوئی ہے یا ہندو کی)؛

۶- یہ اس لیے جُدا ہیں کہ ان کے فنون (خصوصاً فنِ تعمیر......) جدا ہیں.

مسلمانانِ ہند کی آرزوئیں اور غایتیں کیا تھیں ؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی ہو سکتی ہیں جو ہمیشہ مسلمان قوم کی آرزوئیں اور غایتیں رہی ہیں ۔ یہ آرزوئیں دورِ زوال میں جذبہ بازیافت کی صورت میں ظاہر ہوتی رہیں، لیکن ان کی کچھ غایتیں ایسی بھی ہیں جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی موجود ہیں۔

ان غایتوں کی بحث اس مقالے میں شاید غیر متعلق معلوم ہوگی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض غایتیں ایسی ہیں جنھیں ہم تحریکِ بازیافت کا ایک حصّہ قرار دے سکتے ہیں مثلاً ہماری ایک غایت یہ بھی ہے کہ ان مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں اور ایک غایت یہ بھی ہے کہ اس تہذیبی ورثے اور آثار کے تحفظ کے لیے ہم ہمیشہ آمادہ رہیں جو ہندوستان میں رہ گیا ہے۔

اور یُوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان، ہندوستان کے اُس عہدِ دو ادبار سے بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتے جس کے اندر ان کی سلطنت قائم رہی۔

یہ ہے تحریکِ بازیابی کی تاریخ جس کی ابتدا، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے شروع ہوتی ہے ...... اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتی ہے اس دن کو اگر اس تحریک کا یومِ تکمیل اور تحریک کے قائد کو اس تکمیل کا نشانِ اعظم سمجھ لیا جائے تو یہ واقعاتِ تاریخی کے عین مطابق ہوگا۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
لاہور

*

مطبوعہ

نیو لائٹ پریس، افتخار بلڈنگ، چوبرجی، لاہور